ازروے شرع اشیا پر حصولِ قبضہ کی صورتیں

محمد اسحاق ۞

Modern Forms of Possession of Goods in the Light of the *Sharī'ah*

Muhammad Ishaq۞

ABSTRACT

In the modern world, science and technology have revolutionized every aspect of human life including trade transactions and commercial procedures. Individual possession of goods is of paramount importance in commercial affairs, and all the injunctions of the *Sharī'ah* that relate to commercial affairs depend on it. In this age, the buyer and seller are sometimes many miles apart, yet the buying and selling of goods is done without even physical inspection. Moreover, sometimes the goods are further sold before the first buyer gets the possession of these goods. This article attempts to examine these modern cases of commercial transactions and the related issues in the light of Islamic law.

۞ ۞ ۞ ۞ ۞

۞ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اصول الدین، جامعہ کراچی، کراچی۔(dr.ishaqalam@gmail.com)

۞ Assistant Professor, Department of Usool-ud-din, University of Karachi, Karachi. (dr.ishaqalam@gmail.com)

تعارف

تجارتی لین دین کا کوئی معاہدہ ہو یا تحفہ، وصیت اور وراثت وغیرہ کے ذریعے اشیا کا حصول ہو، ان تمام معاملات میں اس شے پر فرد کے قبضے کی ایک اہمیت ہے جو فقہ اسلامی میں معروف ہے۔ اگر اس کا قبضہ شرعی طور پر درست ہوتا ہے تو وہ معاہدہ مکمل اور جائز تصور ہوتا ہے ورنہ اسے شرعی طور پر درست تسلیم نہیں کیا جاتا۔

البتہ آج کل اس ترقی یافتہ دور میں بہت سے معاملات کی شکلیں تبدیل ہو چکی ہیں۔ کیوں کہ یہ ایک انقلابی دور ہے جس میں انٹرنیٹ کی دنیا نے آکر معاملات کو تیز کر دیا ہے۔ میلوں دور بیٹھ کر مال کی خرید و فروخت کے معاہدے بن دیکھے ہو جاتے ہیں اور بہ ظاہر مال اپنی تحویل میں آنے سے قبل فروخت بھی ہو جایا کرتا ہے۔ لوگ ان جدید ذرائع کے استعمال میں سہولت محسوس کرتے ہیں اور ان ہی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن دوسری طرف شرعی طور پر ان اشیا کو دیکھنا اور ان پر قبضہ کرنا ایک لازمی امر ہے۔ جن سے متعلق شرعی اصولوں کو سامنے رکھ کر ان جدید صورتوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ زیر نظر مقالے میں اس طرح کے معاملات کی وضاحت کر کے فقہا کی آرا کی روشنی میں اشیا پر قبضے اور ایجاب و قبول میں اتصال کے مفہوم جیسے اہم مسائل کو بیان کیا جائے گا۔

اصولی طور پر تین صورتیں ایسی ہیں جن کے ذریعے سے انسان کسی شے کا مالک قرار پا سکتا ہے یا اشیا کو جائز طریقے سے اپنے قبضے میں لے سکتا ہے۔

۱۔ مباح چیزوں کو اپنی محنت سے حاصل کرنا۔

۲۔ انتقال ملکیت۔

۳۔ وصیت اور وراثت۔

۱۔ مباح چیزوں کو اپنی محنت سے حاصل کرنا

اللہ تعالیٰ نے اس جہاں میں بہت ساری چیزیں انسان کے فائدے کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ جن سے فائدہ حاصل کرنے میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں۔ یعنی ان اشیا سے استفادے کے معاملے میں کوئی شخص کسی کو روک نہیں سکتا۔ ہاں اگر کوئی شخص محنت کر کے کسی شے کو اپنے لیے خاص کر لیتا ہے تو پھر وہی شخص اس شے کا مالک سمجھا جائے گا۔ لہٰذا اب اگر یہ اس کے استعمال سے کسی کو روکنا چاہے تو اسے اس بات کا حق حاصل ہے۔

ان اشیائے مباحہ میں پانی، شکار، گھاس اور (بنجر) زمینوں جیسی اشیا شامل ہیں۔ اب ان اشیا پر کسی کی ذاتی ملکیت کیسے قائم ہو گی؟

ذیل میں اختصار کے ساتھ اسے ذکر کرتے ہیں۔

پانی

پانی کبھی سمندروں اور دریاؤں کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی نہروں اور برتنوں کی صورت میں۔ سمندروں اور دریاؤں پر کسی فرد کی ملکیت نہیں ہوتی اور یہ اجتماعی املاک میں شمار ہوتے ہیں جن میں تمام لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ جو ان سے استفادہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی منع کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کو سیر اب کرنے کے لیے کسی سمندر یا دریا میں سے نہر کھود کر لائے تو اسے اس کا بھی حق حاصل ہے بشرطے کہ حکومت وقت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو اور دوسرا یہ کہ اس نہر سے کسی کو تکلیف نہ پہنچ رہی ہو؛ کیوں کہ ضرر رسانی تو اپنی ذاتی ملکیتی اشیا کے ذریعے بھی جائز نہیں ہے تو اشیاے مباحہ میں اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ خیال رہے کہ وہ نہر کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں ہو گی، کیوں کہ سمندروں اور دریاؤں کی طرح اس نہر کا حکم بھی اشیاے مباحہ والا ہی ہو گا اور ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ مزید یہ کہ آپ اسی صورت میں دریا سے نہر کھود کر لے جاسکتے ہیں جب آپ کے اس عمل سے راستے میں کسی کو تکلیف کا اندیشہ نہ ہو۔

برتنوں اور مشکیزوں کا پانی

اگر کسی سمندر، دریا یا کسی نہر وغیرہ سے کسی نے اپنی ضرورت کے لیے پانی اپنے ٹنک، مشکیزے اور برتن میں محفوظ کر لیا تو ایسا پانی اس فرد کی ملکیت سمجھا جائے گا اور اس شخص کی اجازت کے بغیر کسی غیر کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہو گا۔ چناں چہ صاحب ہدایہ ایسے پانی کا حکم بیان فرماتے ہیں: ”وإنه صار مملوكا له بالإحراز و انقطع حق غيره عنه.“ [۱] (وہ پانی اس شخص کی ملکیت ہو گا اسے الگ سے محفوظ کرنے کی وجہ سے۔ اور غیر کا حق اس سے ختم ہو جائے گا۔)

گویا پانی مباح الاصل ہے اور ہر شخص کی ضرورت ہے۔ البتہ ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کسی اضافی محنت سے متعلقہ پانی اپنی تحویل میں لے لے تو وہ شخص اس پانی کا تنہا مالک سمجھا جائے گا۔ اب دوسرے لوگ اس شخص کی اجازت کے بغیر اس پانی کو استعمال نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی سمندر یا دریا میں سے پانی لے کر اپنے پاس کسی برتن میں محفوظ کر لے، اس اضافی محنت سے وہ شخص اس پانی کا مالک تصور کیا جائے گا اور اب دوسرے افراد اس کی اجازت کے بغیر وہ پانی نہیں لے سکیں گے۔ البتہ حالت اضطراری میں مضطر پر سے پابندیاں

۱۔ ابو الحسن علی بن ابو بکر برہان الدین مرغینانی، **الهداية**، كتاب الصيد (ملتان: مکتبہ شرکت علمیہ، ۱۳۹۶ھ)، ۴: ۵۱۴۔

اٹھ جاتی ہیں، ایسے شخص کو خنزیر اور بہنے والے خون جیسے محرمات سے بھی اپنی بھوک اور پیاس کی ضرورت پوری کرنے کی اجازت ہوتی ہے، لہٰذا سخت پیاسا انسان جسے اپنی موت اور ہلاکت کا اندیشہ ہو اور کسی دوسرے کے پاس اس کی ضرورت سے زائد پانی موجود ہو تو یہ مجبور شخص اس سے ہتھیار استعمال کیے بغیر لڑ کر پانی لے سکتا ہے۔ بہ دیگر الفاظ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص مالک سے پانی چھین سکتا ہے لیکن اگر پانی اس کی ضرورت سے زائد نہ ہو تو پھر زبردستی اس سے پانی لینے کی اجازت نہیں ہو گی کیوں کہ یہ پانی اتنا ہے کہ اس سے اب صرف اس کی اپنی ضرورت پوری ہو سکتی ہے اور چوں کہ پانی اس کی ملکیت ہے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہو گا لہٰذا ایسی صورت میں اس سے چھیننا شرعًا درست نہیں ہو گا۔

گھاس

پانی کی طرح گھاس بھی مباح ہے۔ سب اس میں برابر کے شریک ہیں۔ البتہ جو اسے کاٹے گا وہی اس کا مالک ہو جائے گا اگرچہ کسی کی مملوکہ زمین ہی میں کیوں نہ ہو۔ البتہ اگر کوئی شخص اس طرح کی گھاس کو اپنی ذاتی ملکیت میں لینا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ شخص اسے کاٹ کر اپنے پاس کسی جگہ محفوظ کرلے، بالکل ایسے ہی جیسے سمندروں اور دریاؤں کے پانی کا کوئی انسان مالک نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی اسے اپنے پاس کسی برتن وغیرہ میں محفوظ کرلے تو پھر متعلقہ شخص اس پانی کا مالک ہو جاتا ہے۔ چناں چہ امام کاسانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ”واما الكلاء الذي ينبت في أرض مملوكة فهومباح غيرمملوك إلا إذا قطعه صاحب الأرض و أخرج فيملكه.“ [۲] (اور وہ گھاس جو کسی کی مملوکہ زمین میں اُگے، مباح ہے جو کسی کی ملکیت نہیں۔ مگر یہ کہ زمین کا مالک اسے کاٹ لے اور الگ کرلے تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔)

اس سلسلے میں فقہائے کرام کے ہاں مملوکہ اور غیر مملوکہ زمین میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ زمین خواہ مملوکہ ہو یا غیر مملوکہ اس پر قدرتی طور پر اُگنے والی گھاس مباح ہے۔ جو چاہے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسے اپنی ضرورت کے لیے کاٹ کرلے جا سکتا ہے۔ اور جو اسے کاٹ لے گا وہی اس کا مالک سمجھا جائے گا۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کو خود سیراب کرے اور اس پر اپنی ملکیت قائم رکھے تو اس صورت میں اس زمین پر اُگنے والی گھاس پر مالک کا حق سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں کسی دوسرے فرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس گھاس کو کاٹ کر اپنی

۲۔ علاؤالدین ابو بکر بن مسعود بن احمد، کاسانی، **بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع**، كتاب الأراضي (کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۴۰۰ھ)، ۶: ۱۹۳۔

ضرورت کے لیے لے جائے۔

شکار

بحر و بر کے جانور اور فضا میں موجود پرندے بھی مباح الاصل ہیں، انھیں جو بھی شکار کرے گا، وہ شکار کیا گیا جانور یا پرندہ اسی کی ملکیت ہو گا بشرطے کہ وہ پہلے سے کسی کی ملکیت نہ ہوں۔ اسے تمام مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے۔ اس کی رضامندی کے بغیر کوئی اس سے وہ شکار نہیں لے سکتا۔ اس قسم کے پرندے بعض اوقات اڑ کر کسی کی زمین میں چلے جاتے ہیں، فقہا کے نزدیک یہ پرندے بھی مباح الاصل ہیں۔ اگر کوئی انھیں شکار کرے گا تو وہی اس کا مالک سمجھا جائے گا۔

ایک وضاحت!

اس پوری تفصیل کے بعد یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ سمندروں اور دریاؤں وغیرہ سے مچھلیاں اور جنگلات سے جانور شکار کرنا اور لکڑیاں وغیرہ کاٹنا، یہ سب مباح افعال ہیں۔ جو بھی محنت کرے گا وہ اپنی محنت کا ثمر ضرور پائے گا اور ان اشیا کا مالک تصور ہو گا۔ البتہ ریاست کا نظم بحال رکھنے اور بہتر مستقبل کے لیے اگر مقامی حکومت اپنے ہاں ان سرگرمیوں پر پابندی لگائے تو اسے اس طرح کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ایسی صورت میں ان پابندیوں کو تسلیم کرنا اور ان کے مطابق چلنا لازم ہو گا اور خلاف ورزی کرنا شرعًا اور قانونًا جرم سمجھا جائے گا۔

إحياء الموات (غیر آباد زمین)

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "فالأرض الموات هي أرض خارج البلد لم تكن ملكًا لأحد و لاحقا له خاصا"[۳] (مواتی زمین وہ ہے جو شہر سے باہر ہو، کسی کی ملکیت نہ ہو اور نہ ہی اس پر کسی کا خاص حق ہو۔)

امام جرجانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب **التعریفات** میں تحریر فرماتے ہیں: "الموات مالامالک له ولاینتفع به من الأراضي لإنقطاع الماء عنها أو لغلبته عليها أو لغيرهما ممايمنع الإنتفاع بها."[۴] (مواتی

۳۔ نفس مصدر، ۶: ۱۹۴۔

۴۔ سید جرجانی علی، **التعریفات** (بیروت: دار المنار، س ن)، ۱۶۴۔

زمین وہ ہے جس کا کوئی مالک نہ ہو۔ اور اس زمین سے پانی بند ہو جانے یا زیادہ ہو جانے کے سبب فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو یا اس کے علاوہ کوئی ایسی وجہ جو اس زمین سے فائدہ اٹھانے سے مانع ہو۔)

گویا کہ فقہا کے نزدیک مواتی زمین وہ کہلاتی ہے جو کسی کے قبضے میں نہ ہو، آبادی سے دور ہو اور اس سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا ہو، جس کی وجہ پانی کی کمی یا زیادتی وغیرہ جیسی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں مذہب احناف کی مزید وضاحت کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

الارض المواات: هي أرض خارج البلد، لم تكن ملكا لأحد ولاحقا له خاصا. ففي داخل البلد لايكون مواتا أصلا. وكذا ما كان خارج البلدة من مرافقها محتطبا لأهلها أو مرعى لهم فلايجوز إحياء ماقرب من العامر لأنه من مرافقه التابعة له و يترک مرعى لأهل القرية و مطرحا لحصائدهم لتحقق حاجتهم إليها فلايكون مواتاكالطريق والنهر.[۵]

(مواتی زمین وہ ہے جو شہر سے باہر ہو۔ کسی کی ملکیت بھی نہ ہو اور نہ ہی اس پر کسی کا کوئی خاص حق ہو۔ شہر کے اندر کی زمین موات بالکل بھی نہیں ہو گی۔ اور اسی طرح وہ زمین جو شہر سے باہر ہے لیکن اس سے شہر کو فائدہ ہے، مثلاً شہر والے اس سے لکڑیاں لاتے ہیں یا ان کی چراگاہیں ہیں۔ پس آبادی کے قریب والی زمین کو آباد کرنا جائز نہیں اس لیے کہ یہ آبادی کے منافع میں سے ہے اور اس کے تابع ہے۔ اور اسے بستی والوں کی چراگاہ اور کھیتیاں کھانے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا ان کی ضرورت ثابت ہونے کی وجہ سے۔ لہٰذا راستہ اور نہر کی طرح یہ زمین موات نہیں ہو گی۔)

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں احناف کے ہاں شہر کے اندر کی زمین کبھی مواتی نہیں ہو سکتی اور باہر کی زمین اس صورت میں مواتی ہو سکتی ہے جب اس کا مالک معلوم نہ ہو اور اس زمین سے شہر والوں کو کوئی فائدہ بھی نہ ہو۔ اگر شہر والے اس زمین سے اپنی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں تو ایسی زمین بھی مواتی نہیں ہو سکتی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ غیر آباد زمین آبادی سے کتنی دور ہو؟ اس کے درمیان کتنی مسافت ہونی چاہیے؟ اس حوالے سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "إن أرض المواات بقعة لو وقف على أدناها من العامر رجل فنادى بأعلى صوته لم يسمعه من العامر."[۶] (مواتی زمین اس حصے کو کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی انسان آبادی کے آخری حصے میں کھڑے ہو کر بلند آواز سے چلائے تو آبادی سے وہ آواز وہاں نہ سنائی دے۔)

۵- وہبہ الزحیلی، **الفقه الإسلامي و أدلته** (دمشق: دار الفکر، ۱۴۰۴ھ)، ۵: ۵۵۳۔

۶- کاسانی، مرجع سابق، ۶: ۱۹۴۔

مواتی زمین کی آبادی میں حاکم کی اجازت کی اہمیت موجودہ دور کے تناظر میں

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی رو سے جو اسے آباد کرے گا وہی اس کا مالک ہوگا البتہ ریاستی نظم کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے اصولوں کی روشنی میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایسی زمین کی ملکیت کے لیے علی الاطلاق حاکم کی اجازت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اگر ایسی زمین شہر سے قریب ہے تو حاکم کی اجازت لازم ہے ورنہ نہیں۔ امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور صاحبین رحمہما اللہ اس سلسلے میں حاکم کی اجازت کو شرط نہیں ٹھہراتے بلکہ یہ حضرات اس اجازت کو استحباب کے درجہ میں رکھتے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقال الصاحبان والشافعي و الحنابلة: من أحيا أرضا مواتا تملكها وإن لم يأذن له فيها الإمام، اكتفاء باذن رسول الله صلى الله عليه و سلم:"من أحيا أرضا ميتة فهي له" الصادر بطريق الشرع والنبوة، ولأنه مال مباح كالاحتطاب والاصطياد، سبقت إليه يد المحيى، فيملكه. ويؤيده حديث البخاري عن عائشة: "من عمر أرضا ليست لأحد فهو أحق بها" فظاهره أنه لايشترط إذن الإمام لكن يستحب استئذانه.[۷]

(صاحبین، شوافع اور حنابلہ کہتے ہیں: جس نے مردہ زمین آباد کی وہ اس کا مالک ہے اگرچہ حاکم نے اسے اس کی اجازت نہ دی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی اس اجازت پر اکتفا کرتے ہوئے "جس نے مردہ زمین کو آباد کیا تو وہ اسی کی ہے۔" اور یہ حکم بہ طور شرع اور نبوت ہے۔ اور اس لیے کہ یہ لکڑیاں چننے اور شکار کرنے کی طرح مال مباح ہے۔ اس کی طرف آباد کرنے والے نے سبقت کی ہے تو وہ اس کا مالک ہے۔ اور اس کی تائید **صحیح بخاری** میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس روایت سے بھی ہوتی ہے "جس نے ایسی زمین آباد کی جو کسی کی نہ ہو تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔" اس حدیث کا ظاہر بتلاتا ہے کہ حاکم کی اجازت شرط نہیں ہے۔ لیکن اجازت لے لینا مستحب ہے۔)

ان حضرات نے مواتی زمین کو لکڑیوں اور شکار پر قیاس کرتے ہوئے اسے مال مباح قرار دے دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد چوں کہ علی الاطلاق ہے لہٰذا اس بنا پر ان حضرات کے ہاں حاکم کی اجازت اس کے لیے شرط نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی رحمۃ اللہ علیہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کی وضاحت فرماتے ہیں: "أن يكون الإحياء عند أبي حنيفة بإذن الحاكم، لحديث "ليس للمرء إلا ما طابت به نفس إمامه" فإذا لم يأذن لم تطب نفسه به. ولأن هذه الأراضي كانت في أيدى الكفرة ثم صارت فى أيدى

۷۔ زحیلی، **الفقه الإسلامي و أدلته**، ۵: ۵۵۲۔

المسلمين فهی فیئ. و الإمام هو المختص بتوزيع الفيئ كالغنائم.[۸] (امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں زمین کی آبادی حاکم کی اجازت سے ہو اس حدیث کی وجہ سے کہ "آدمی کے لیے اس کے حاکم کی رضا کے بغیر کوئی چیز جائز نہیں" جب اس نے اجازت نہیں دی تو وہ اس پر راضی نہیں۔ نیز اس لیے کہ یہ زمینیں کافروں کے قبضہ میں تھیں اور پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں۔ تو یہ فیئ ہیں اور حاکم اموال غنیمت کی طرح فیئ کی تقسیم کے ساتھ بھی خاص ہے۔

ائمہ احناف کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ مفصل تحریر فرماتے ہیں:

فالملک في الموات يثبت بالإحياء بإذن الإمام عند أبي حنيفة و عند أبي يوسف و محمد رحمهم الله تعالى يثبت بنفس الإحياء وإذن الإمام ليس بشرط وجه قولهما قوله عليه الصلاة و السلام من أحيا أرضا ميتة فهي له وليس لعرق ظالم فيه حق أثبت الملک للمحي من غير شريطة إذن الإمام ولأنه مباح استولى عليه فيملكه بدون إذن الإمام...و لأبي حنيفة عليه الرحمة ما روي عن النبی صلى الله عليه و سلم أنه قال ليس للمرء إلا ما طابت به نفس إمامه فإذا لم يأذن فلم تطب نفسه به فلا يكون له و لأن الموات غنيمة فلابد للاختصاص به من إذن الإمام كسائر الغنائم. والدليل عليه أن غنيمة اسم لما اصيب من أهل الحرب بإيجاف الخيل والركاب والموات كذلک لأن الأرض كلها كانت تحت أيدى أهل الحرب استولى عليها المسلمون بخلاف الصيد و الحطب و الحشيش لأنها لم تكن في يد أهل الحرب فجاز أن تملک بنفس الاستيلاء و إثبات اليد عليها.[۹]

(امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں کسی غیر آباد زمین کو آباد کرنے سے ملکیت حاکم کی اجازت سے ثابت ہوتی ہے۔ اور امام ابو یوسف و محمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک صرف آباد کرنے سے ہی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور حاکم کی اجازت اس کے لیے شرط نہیں ہے۔ صاحبین کے قول کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "جس نے کسی مردہ زمین کو آباد کیا تو وہ اسی کی ملکیت ہو گی اور کسی ناحق آباد کار کے لیے اس میں کچھ بھی نہ ہو گا" اس حدیث میں آپ نے آباد کرنے والے کے لیے حق کو بغیر حاکم کی اجازت کے شرط کے ثابت کیا ہے۔ اور اس لیے کہ وہ زمین مباح ہے اور کسی نے اس پر غلبہ حاصل کیا تو وہ حاکم کی اجازت کے بغیر اس کا مالک ہو جائے گا...اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "کسی شخص کے لیے وہی جائز ہے جو اسے اس کا حاکم خوشی سے دے" جب اس نے

۸۔ نفس مرجع، ۵: ۵۶۲۔

۹۔ کاسانی، مرجع سابق،۶: ۱۹۵۔

اجازت نہیں دی تو اس پر اس کا نفس خوش نہیں۔ تو وہ چیز اس کی نہ ہوگی۔ اور مزید یہ کہ مواتی زمین غنیمت ہے لہٰذا اس کے لیے حاکم کی اجازت کا خاص ہونا لازم ہے۔ جیسا کہ تمام غنیمت کے اموال کا یہی حکم ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ غنیمت اسی مال کو کہا جاتا ہے جو گھوڑوں اور اونٹوں کو دوڑانے کے بعد کافروں کی طرف سے ملے۔ اور مواتی زمین کا بھی یہی حکم ہے اس لیے کہ وہ پوری زمین کافروں کی تھی جس پر مسلمانوں نے جبری اور زبردستی غلبہ حاصل کر لیا۔ بخلاف شکار، لکڑی اور گھاس کے کیوں کہ یہ چیزیں اہل حرب کے ہاتھوں میں نہ تھیں لہٰذا صرف غلبہ پانے ہی سے ان کا ملک میں آنا جائز ہو جاتا ہے۔)

لہٰذا یہ مکمل زمین غنیمت کے حکم میں ہوگی۔ پس باقی اموال غنیمت کی طرح اس کا بھی یہ حکم ہوگا کہ کچھ مسلمان حاکم کی اجازت کے بغیر ایسی زمین کے مالک نہیں ہوسکتے۔ بخلاف شکار، لکڑیوں اور گھاس کے کہ وہ کافروں کی ملکیت نہیں تھیں تو جو اس پر غلبہ حاصل کر کے اس پر اپنی ملکیت ثابت کر دے وہ مالک ہوگا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مواتی زمین کو مال غنیمت کے مثل قرار دیتے ہیں اس لیے کہ یہ زمینیں کافروں کی ملکیت میں تھیں اور پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں۔ اور اسی کو غنیمت کہا جاتا ہے، جس کی تقسیم حاکم کی اجازت کے بغیر درست نہیں ہے۔ لہٰذا مواتی زمین کے لیے حاکم کی اجازت لازمی ہے۔ صاحبین رحمۃ اللہ علیہم اسے لکڑیوں اور شکار وغیرہ کے مثل قرار دیتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ چیزیں کافروں کی ملکیت نہیں تھیں، تو ایسی اشیا پر ملکیت ثابت کرنے کے لیے حاکم کی اجازت بھی لازم نہ ہوگی۔

اس پوری تفصیل کو جاننے کے بعد بہ غور جائزہ لیا جائے تو بہ خوبی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ریاست اور حکومت کا نظم بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس معاملے میں حاکم کی اجازت لازم ہو ورنہ آج کل کی ہاؤسنگ سوسائیٹیاں ملک کی ساری غیر آباد زمینوں پر قابض ہو جائیں اور اپنے کاروبار کو جہاں تک چاہیں پھیلاتے رہیں۔ اور غریب غریب تر ہوتا رہے کیوں کہ اسباب کی کمی کی وجہ سے ظاہر ہے وہ زمینوں کو آباد نہیں کر سکیں گے۔ چناں چہ ریاستی نظم کے حوالے سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اتنی مضبوط اور سودمند ہے کہ آج وہ مملکتیں جو فقہ شافعی اور فقہ حنبلی پر عمل پیرا ہیں، اس معاملے میں اپنے ہاں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی رائے کو قانون کا درجہ دیتی ہیں۔

۲۔ انتقالِ قبضہ

کسی شے کو اپنی تحویل میں لینے یا کسی دوسرے کی تحویل میں دینے کا یہ دوسرا طریقہ ہے جس میں وہ شے ایک شخص کی ملکیت سے نکل کر دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس طرح اب اس شے پر قبضہ پہلے والے فرد کا نہیں رہتا بلکہ دوسرا فرد اس پر شرعی قبضہ کر لیتا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ انتقال قبضہ بہ ذریعہ تجارت بھی ہو سکتا ہے اور بہ ذریعہ ہبہ اور تحفہ بھی۔ دونوں صورتوں میں اس دوسرے فرد کی

ملکیت متعلقہ شے پر درست ہو گی۔

ان دونوں صورتوں کی تفصیلات اور شرائط فقہ کی کتب میں مفصل موجود ہیں۔ البتہ موجودہ دور کی تجارتی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں کچھ باتوں کی وضاحت کافی مفید ہو گی جو دورِ جدید کے تجارتی ذرائع ہیں اور کئی لوگ اسے اپنا ذریعہ معاش بنا کر اس سے استفادہ بھی کر رہے ہیں۔ ذیل میں اس کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔

تجارت بذریعہ انٹرنیٹ

انٹرنیٹ کے استعمال سے زندگی کی بہت ساری چیزوں میں تیز رفتاری آ گئی ہے۔ جن امور میں پہلے گھنٹوں خرچ ہوتے تھے اب وہ کام بیٹھے بیٹھے منٹوں میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ گویا اب تجارت بھی انٹرنیٹ کی دنیا میں منتقل ہو چکی ہے۔ اس طرزِ تجارت سے لوگوں کو کافی سہولت ہے کہ کسی بھی قسم کی مشقت کے بغیر گھر بیٹھے اشیا کی خرید و فروخت کر سکتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنا وقت بھی بچا سکتے ہیں۔ شرعی قوانین کا لحاظ رکھا جائے تو یہ طرزِ تجارت کافی مفید ہے۔ البتہ عام طور پر اس میں جن امور کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بن دیکھے اشیا کی خرید و فروخت، ایجاب و قبول کا ایک مجلس میں نہ ہونا اور بیع قبل القبض جیسے اہم امور ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ امور ایسے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ہم آن لائن تجارت میں ان امور کا کس طرح لحاظ رکھ سکتے ہیں۔

بن دیکھے اشیا کی خرید و فروخت

بغیر دیکھے اشیا کی خرید و فروخت کا معاملہ اب اتنا پیچیدہ نہیں رہا؛ کیوں کہ اب عموماً خریدار پہلے سے اس چیز کی حقیقت کو انٹرنیٹ کے ذریعے معلوم کر چکا ہوتا ہے اور یا پھر ویڈیو کال کے ذریعے اس چیز کو دیکھ کر اپنی تسلی کر لیتا ہے۔ اور بالفرض اگر یہ دونوں باتیں نہ پائی جائیں تو شرعی قانون کی رو سے خریدار کو خیارِ رؤیت کا حق حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس چیز کو دیکھنے کے بعد اگر متعلقہ چیز بتائے ہوئے اوصاف سے ہٹ کر ہو تو خریدار اسے رد کر سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی واضح حدیث ہے: "من اشترى شيئا لم يره فهو بالخيار إذا رآه إن شاء أخذه و إن شاء رده." [۱۰] (جس نے بغیر دیکھے کوئی چیز خریدی تو جب وہ اسے دیکھ لے تو اسے اختیار ہے، چاہے تو قبول کر لے اور اگر چاہے تو رد کر دے۔)

۱۰۔ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، **السنن الکبری**، كتاب البيوع، باب من قال يجوز بيع العين الغائب (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۲۴ھ)، ۵: ۴۳۹۔

اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے اگر خریدار کو یہ اختیار دے دیا جائے تو اس قسم کی تجارت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اور بہت سی کمپنیاں یہ اختیار دیتی بھی ہیں اور بہ خوشی اپنا سامان واپس لے لیتی ہیں۔

ایجاب و قبول میں مجلس کا ایک نہ ہونا

سب سے پہلے ایجاب و قبول کا مفہوم سمجھ لیا جائے کہ بائع اور مشتری دونوں میں سے جو بات میں پہل کرے اس کی بات کو ایجاب اور دوسرے کی بات کو قبول کہا جاتا ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے ان دونوں باتوں کا ایک ہی مجلس میں ہونا ضروری ہے۔ اس تیز ترین تجارتی دور میں بذریعہ فون اور انٹرنیٹ تجارت کی جاتی ہے جس سے بہ ظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایجاب و قبول ایک مجلس میں نہیں ہو رہا اور تجارت فاسد ہو رہی ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں فقہا کی آرا کی روشنی میں اتصال مجلس کا مفہوم جاننے کی ضرورت ہے۔ فقہا کی آرا کو سامنے رکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایجاب و قبول کے دوران مجلس ایک ہونے سے مراد ان دونوں باتوں میں اتصال کا پایا جانا ہے کہ اگر ایک شخص نے کسی کو بہ ذریعہ قاصد، خط یا ای میل کسی شے کی خرید و فروخت کے حوالے سے پیغام بھیجا تو پیغام موصول ہوتے ہی اسے قبول کرنا ہو گا۔ اگر اس پیغام کو اسی وقت قبول کر لیا تو یہ ایجاب و قبول کا ایک ہی مجلس میں پایا جانا سمجھا جائے گا۔ چناں چہ امام کاسانی رحمۃ اللہ علیہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلے کی وضاحت کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

أما الرسالة فهي أن يرسل رسولا إلى رجل و يقول للرسول إني بعت عبدي هذا من فلان الغائب بكذا فاذهب إليه و قل له أن فلانا أرسلني إليک و قال قل له إني قد بعت عبدي هذا من فلان بكذا فذهب الرسول و بلغ الرسالة فقال المشتري في مجلسه ذلک قبلت انعقد البيع لأن الرسول سفير و معبر عن كلام المرسل ناقل كلامه إلى المرسل إليه فكأنه حضر بنفسه فأوجب البيع و قبل الآخر في المجلس. و أما الكتابة فهي أن يكتب الرجل إلى رجل أما بعد فقد بعت عبدي فلانا منک بكذا فبلغه الكتاب فقال في مجلسه اشتريت لأن خطاب الغائب كتابه فكأنه حضر بنفسه و خاطب بالإيجاب و قبل الآخر في المجلس۔[۱۱]

(بہر حال پیغام یہ ہے کہ کوئی شخص قاصد کو کسی کے پاس یہ کہہ کر بھیجے کہ میں نے اپنا یہ غلام اتنی قیمت کے بدلے میں فلاں کو بیچ دیا ہے، تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ میں نے اسے اپنا یہ غلام اتنی قیمت میں بیچ دیا ہے۔ چناں چہ قاصد گیا اور اس نے پیغام پہنچا دیا تو مشتری نے اسی مجلس میں کہا میں نے قبول کیا تو بیع منعقد ہو گئی کیوں کہ قاصد بھیجنے والے کی طرف سے سفیر ہے اور اسی کی بات کو بیان کر رہا ہے اور اسی کی بات کو مشتری کے سامنے نقل کر رہا ہے۔ تو گویا بائع خود

۱۱۔ کاسانی، بدائع الصنائع، ۵: ۱۳۸۔

حاضر ہے تو بیع ثابت ہو گئی اور دوسرے نے اس کی بات کو مجلس میں قبول کیا ہے۔ اور خط یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو خط لکھ کر کہے کہ میں نے اپنا فلاں غلام تمھیں اتنی قیمت کے بدلے میں بیچ دیا ہے، خط پہنچ جانے پر مشتری نے اسی مجلس میں کہا میں نے قبول کیا۔ (یہ بھی درست ہے) کیوں کہ یہاں ایک غائب کی طرف سے بذریعہ خط بات ہو رہی ہے تو گویا وہ خود موجود ہے اور ایجاب کر رہا ہے اور مشتری نے اس کی بات کو اسی مجلس میں قبول کیا ہے۔)

اس صراحت سے معلوم ہوا کہ مجلس ایک ہونے کا مفہوم صرف ایجاب و قبول کا ایک ساتھ پایا جانا ہے، نہ کہ بائع اور مشتری کا ایک ہی جگہ بیٹھ کر بات چیت کرنا۔ لہٰذا قاصد کے پیغام پہنچانے اور خط یا ای میل موصول ہونے پر فوراً اس بات کو قبول کرنا ہو گا۔

بیع قبل القبض اور اس کا حکم

ان جدید ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے آپ اپنے ملک میں بیٹھ کر دوسرے ممالک میں کئی کئی ٹن سامان خرید لیتے ہیں اور پھر کسی تیسرے فرد کے ہاتھ فروخت بھی کر دیتے ہیں۔ شریعت کی رو سے اس طرزِ تجارت کا کیا حکم ہو گا جب کہ بہ ظاہر اب تک وہ سامان تجارت آپ کے قبضے میں نہیں آیا اور اس سے پہلے ہی آپ اسے کسی اور پر فروخت کر دیتے ہیں۔ شرعی طور پر اس کی کتنی گنجائش ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ امام کاسانی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں: "لايجوز التصرف في المبيع المنقول قبل القبض بالإجماع و في العقار اختلاف." [۱۲] (اس پر اجماع ہے کہ اشیاے منقولہ میں مبیع پر قبضے سے پہلے تصرف جائز نہیں ہے اور غیر منقولی اشیا میں اختلاف ہے۔)

فقہاے احناف اس سلسلے میں منقولی اور غیر منقولی اشیا میں فرق کرتے ہیں اور غرر کی وجہ سے اشیاے منقولہ میں بیع قبل القبض کو جائز نہیں سمجھتے۔ اشیاے غیر منقولہ میں چوں کہ اس زمین کے ہلاک ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا تو اس بنا پر وہاں بیع قبل القبض کی گنجائش موجود ہے۔

مذکورہ بالا مسئلے میں فقہاے کرام کی آرا پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ احادیث میں قبضے کے مفہوم کی صراحت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تعبیر کو عرف پر چھوڑ دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ فقہا نے مختلف اشیا پر ملکیت کے حوالے سے قبضے کا مفہوم مختلف بیان کیا ہے جس کی تفصیلات فقہ کی کتب میں موجود ہیں لیکن یہاں طوالت سے بچنے کے لیے اپنی معروضات کو مذکورہ بالا مسئلے تک ہی محدود رکھنا زیادہ مناسب ہو گا۔ چناں چہ علامہ

۱۲۔ نفس مصدر، ۵: ۲۳۴۔

کاسانی رحمۃ اللہ علیہ قبضے کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں: "فالتسليم و القبض عندنا هو التخلية و التخلي و هو أن يخلي البائع بين المبيع و المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع و المشتري قابضا له." (۱۳) (ہمارے ہاں مبیع کو حوالے کرنے اور اس پر قبضہ کرنے سے مراد تخلیہ ہے اور تخلیہ یہ ہے کہ بائع، مبیع اور مشتری کے درمیان سے اس طرح نکل جائے کہ ان دونوں کے درمیان حائل ہونے والی رکاوٹ دور ہو جائے اور مشتری کے لیے مبیع میں تصرف ممکن ہو جائے تو بائع مبیع کو سپرد کر دینے والا اور مشتری اس پر قبضہ کرنے والا سمجھا جائے گا۔)

خلاصۃ الفتاوی میں ہے: "إن بالتخلية يقع القبض و إن كان المعقود عليه يبعد عنها." (۱۴)

(مبیع اگرچہ دور ہو تو تخلیہ سے قبضہ ثابت ہو جائے گا۔)

اور **فتاوی قاضی خان** میں ہے: "أجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضا." (۱۵)

(اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ بیع صحیح میں تخلیہ قبضہ سمجھا جائے گا۔)

امام کاسانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان کردہ مفہوم واضح ہے جسے فتاوی قاضی خان والے اجماع بھی بتا رہے ہیں۔ اس کی رو سے بائع کا اس سامان تجارت کو جہاز میں چڑھا دینا اور اس کی مکمل کاغذی کارروائی کر لینا مشتری کا قبضہ ہی کہلائے گا کیوں کہ اس عمل سے وہ سامان بائع کی ملکیت اور تصرف سے نکل کر مشتری کی ملکیت اور تصرف میں چلا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں پیش آنے والے نقصان کا ذمے دار بھی مشتری ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا مشتری کے لیے اس سامان تجارت کو آگے فروخت کر دینا جائز ہو گا کیوں کہ اب یہ بیع قبل القبض نہیں بلکہ بعد القبض ہے۔

ہبہ (تحفہ)

ہبہ کے ذریعے بھی اشیا کی ملکیت افراد کے درمیان منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ شرعاً درست ہے اور اس پر ائمہ مجتہدین کا اجماع بھی ہے۔ البتہ یہاں اس سلسلے میں ایک مسئلے کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض اوقات والدین اپنی زندگی میں اپنی جائے داد میں سے کچھ حصہ زمین، مکان یا دکان کی صورت میں اپنی اولاد میں سے کسی کو دے دیتے

۱۳۔ نفس مصدر، ۵: ۲۴۴۔

۱۴۔ شیخ طاہر بن عبد الرشید، **خلاصۃ الفتاوی** (کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ، س ن)، ۳: ۸۹۔

۱۵۔ فخر الدین حسن بن منصور، **فتاوی قاضی خان**، باب في قبض المبيع و مايجوز من التصرف (کلکتہ: ایشیاٹک لیتھوگرافک کمپنی، ۱۸۳۵ء)، ۲: ۴۷۸۔

ہیں اور یہ دینا بہ طور ہبہ ہوتا ہے کیوں کہ وراثت سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں جو غور کرنے والی بات ہے وہ یہ ہے کہ عموماً وہ مکان ہبہ کر دیا جاتا ہے جس میں والدین خود بھی رہائش پزیر ہیں یا وہ دُکان دے دی جاتی ہے جو اب تک خود والد کے استعمال میں ہے۔ از روے شرع صرف کاغذات بیٹے کے نام کرا دینے سے وہ جاے داد بیٹے کی نہیں ہو جاتی تاوقتے کہ وہ جگہ مکمل طور پر خالی کر کے بیٹے کے حوالے نہ کر دی جائے۔ محض کاغذات بیٹے کے نام کرا کر اس جاے داد کو یہ سوچ کر اپنی ملکیت میں رہنے دینا کہ ہماری وفات کے بعد بیٹا اس کا مالک سمجھا جائے گا، از روے شرع درست نہیں ہے؛ کیوں کہ ہبہ کے طور پر دی جانی والی شے پر اسی مجلس میں بیٹے کے لیے قبضہ کرنا لازم ہے۔

ہبہ سے متعلق علامہ مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: "فإن قبض الموهوب له في المجلس بغير أمر الواهب جاز استحسانا و إن قبض بعد الافتراق لم يجز إلا أن يأذن له الواهب في القبض." [۱۶] (پس اگر موہوب لہ (جسے ہبہ کیا جائے) نے اسی مجلس میں واہب (ہبہ کرنے والا) کی اجازت کے بغیر قبضہ کیا تو یہ استحساناً جائز ہے۔ اور اگر اس پر مجلس سے الگ ہو جانے کے بعد قبضہ کیا تو جائز نہیں، مگر یہ کہ واہب قبضہ کرنے کی اجازت دے دے۔)

اور یہاں قبضے سے تخلیہ بھی مراد نہیں لیا جا سکتا کیوں کہ ایک تو جو چیز ہبہ کی جا رہی ہے وہ موہوب لہ سے دور نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اب تک وہ جاے داد اصل مالک یعنی والد کی ملکیت سے نکلی بھی نہیں ہے اور بیٹا اس کا مکمل طور پر مالک نہیں ہوا۔

۳۔ وصیت اور وراثت

وصیت اور وراثت بھی ایسے دو طریقے ہیں جن کے ذریعے سے انسان دوسروں کے مال و جاے داد کا مالک ہو سکتا ہے۔

وصیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی میں کسی شخص کے لیے اپنے مال و جاے داد میں سے کچھ حصہ مقرر کر دینا جو اسے وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد ملے گا۔

شرعاً یہاں دو باتوں کی پابندی لازم ہے۔

ایک یہ کہ وصیت اپنے کسی وارث کے لیے نہ کی جائے۔ دوسرا یہ کہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت نہ ہو۔

۱۶۔ مرغینانی، **الهداية**، کتاب الهبة، ۳: ۲۸۳۔

اب ورثا کے ذمے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ مرحوم کے ترکے کے تہائی مال میں سے اس وصیت کو پورا کریں۔ اگر وصیت اس سے زائد کی ہوئی تب بھی ورثا تہائی مال میں سے ہی اس وصیت کو پورا کرنے کے پابند ہوں گے۔ ہاں اگر تمام ورثا راضی ہوں تو تہائی سے زائد میں بھی وصیت پوری کر سکتے ہیں۔

ابتدائے اسلام میں جب وراثت سے متعلق تفصیلی احکامات نازل نہیں ہوئے تھے، اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کرنا فرض تھا البتہ وراثت کے تفصیلی احکامات آجانے کے بعد پھر ورثا کے حق میں وصیت کو کالعدم قرار دے کر اس فرضیت کو ختم کر دیا گیا کیوں کہ اب ان کے مکمل حصے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خود بیان فرما دیے ہیں۔ لیکن ورثا کے علاوہ کے حق میں یہ حکم برقرار رکھا گیا۔ گو کہ یہ بھی لازم نہیں ہے لیکن اگر کوئی کرنا چاہے تو تہائی مال کی حد تک غیر وارث کے لیے وصیت کر سکتا ہے۔ البتہ اس بات میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ اگر کسی شخص نے وصیت کر دی تو ورثا پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس وصیت کو ہر صورت میں پورا کریں۔ ہاں اگر وہ وصیت کسی خلاف شرع کام کے لیے کی گئی ہو تو پھر ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت بدل جاتی ہے جس کی وجہ سے ایسی وصیتوں کو پورا کرنا درست نہیں ہوتا۔

نتائج

۱۔ اشیائے مباحہ پر کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر کوئی شخص ذاتی طور پر محنت کر کے اس طرح کی کسی چیز کو اپنی تحویل میں لے لے تو وہ اس کا ملک سمجھا جائے گا۔ مثال کے طور پر سمندر کی مچھلیاں کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتیں لیکن اگر کوئی شخص مچھلی شکار کر لے تو وہ شخص اس شکار کی ہوئی مچھلی کا مالک سمجھا جائے گا۔ البتہ اگر مفاد عامہ کی خاطر حکومت ان اشیائے مباحہ کے حصول پر عارضی طور پر پابندی لگا دے تو اسے اس طرح کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۲۔ مواتی یعنی غیر آباد زمینوں کے معاملے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر عمل کرنا بہتر ہے لہٰذا ایسی زمین حکومت کی اجازت سے کوئی آباد کرے گا تو وہ مالک ہو سکے گا ورنہ نہیں۔ حکومتی نظم برقرار رکھنے کے لیے اسی رائے پر عمل ضروری ہے۔

۳۔ انٹرنیٹ کے ذریعے تجارت بالکل درست ہے بہ شرطے کہ متعلقہ اشیا کو ویڈیو وغیرہ کے ذریعے مکمل طور پر دیکھ لیا جائے یا پھر خریدار کا کوئی وکیل اس جگہ جا کر دیکھ لے ورنہ مشتری کو خیار رؤیت حاصل ہو گا جس کی رو سے اگر دیکھنے کے بعد وہ چیز مشتری کو سمجھ میں نہ آئی اور بیان کردہ تفصیلات کے مطابق نہ

ہوئی تو مشتری اسے واپس کر سکتا ہے۔

۴۔ اگر دوسرے شہر یا ملک میں بیٹھے کسی سے کچھ خریدا تو شرعی طور پر ایجاب و قبول میں اتصال کا معنی ان دونوں باتوں کا ایک ساتھ پایا جانا ہے۔ لہٰذا اگر ای میل وغیرہ کے ذریعے کسی نے اس سلسلے میں رابطہ کیا تو دوسرا شخص ای میل دیکھتے ہی فوراً اسے جواب دے دے تو ایجاب و قبول ایک ہی مجلس میں ہونا سمجھا جائے گا اور درست ہو گا۔ بعض فقہاے کرام کچھ توقف کرنے کو بھی ایجاب و قبول میں مانع نہیں سمجھتے اور اس صورت میں بھی اسے جائز سمجھتے ہیں جو کہ مناسب بات ہے۔

۵۔ بیع قبل القبض ناجائز ہے۔ البتہ اگر مبیع یعنی خریدا ہوا مال دوسرے شہر یا ملک سے آرہا ہے اور مشتری اپنے پاس پہنچنے سے قبل اسے کسی پر فروخت کر دے تو یہ صورت جائز ہے کیوں کہ فقہا کے نزدیک اس صورت میں قبضے کا معنی تخلیہ ہے یعنی اس مال پر سے بائع کا تصرف مکمل طور پر ختم ہو جائے اور مشتری کے تصرف میں آجائے۔ یہاں یہی صورت ہے کیوں کہ مال کارگو ہو جانے کے بعد بائع کے تصرف سے نکل کر مشتری کے تصرف میں آجاتا ہے لہٰذا اب اسے آگے فروخت کر دینا بیع بعد القبض ہی سمجھا جائے گا اور درست ہو گا۔

۞ ۞ ۞ ۞ ۞

List of Sources in Roman Script

- ‘Abd al-Rashid, Tahir b. *Khulasat al-Fatawa*. Quetta: Maktabah Rashidiyyah, n.d.
- Al-Bayhaqi, Abu Bakr Ahmad b. Husayn. *Al-Sunan al-Kubra*. Beirut: Dar al-Kutub al- ‘Ilmiyyah, 1424 AH.
- Al-Jurjani, ‘Ali b. Muhammad al-Sayyid al-Sharif. *Al-Ta‘rifat*. Beirut: Dar al-Manar, n.d.
- Al-Kasani, ‘Ala’ al-Din Abu Bakr b. Mas‘ud. *Bada’i‘ al-Sana’i‘*. Karachi: H. M. Sa‘id Company, 1400 AH.
- Al-Marghinani, Ali b. Abi Bakr. *Al-Hidayah.* Multan: Maktabah Sharikat-i ‘Ilmiyyah, 1396 AH.
- Al-Zuhaili, Wahbah. *Al-Fiqh al-Islami wa Adillatuhu*. Damascus: Dar al-Fikr, 1404 AH.
- Mansur, Fakhr al-Din Hasan b. *Fatawa Qazikhan*. Calcutta: Asiatic Lithograph Company, 1835.